افضال احمد سید کی نظم میں شعریاتِ رزم

فرح عابد/ڈاکٹر طارق ہاشمی

ABSTRACT:
"Afzal Ahmad Syed is a contemporary Urdu poet and translator, known for his mastery of both classical and modern Urdu poetic expression. He is also known for his Epic poetry style and dialectical expressions. Syed's Nazm is remarkable in its surreal narrative power, its stark imagery and its use of majestic diction. A global poetic vision, a modern sensibility, and a powerful diction fuse in his poetry to create a profoundly powerful narrative solitude and alienation."

۱۹۷۰ء کے بعد نظم نگاروں کی ایک ایسی کھیپ سامنے آتی ہے جنہوں نے نہ صرف نئی شاعری کے فکری تسلسل اور اسلوبیاتی زاویہ کار کو نظم میں برقرار رکھا بلکہ اپنی متخیّلہ سے کام لیتے ہوئے نت نئے تجربات کو بھی نظم کا حصہ بنایا۔ یہ شاعر کسی ادبی لسانی یا سیاسی گروہ سے وابستہ تھے۔ نہ ہی کسی رجحان یا تحریک سے منسلک تھے۔ ان شعراء کے پیش نظر ادب میں اپنی شناخت اور مقام کے تعین کا مسئلہ بھی موجود نہ تھا۔ انہوں نے متن کو اساس مان کر اپنی شاعری کو بنیاد بنا کر اُردو کے تخلیقی سرمائے کو ثروت مند بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کیا۔ ان کے پیش نظر انسانی مشکلات و مسائل کا انبار بے پایاں تھا۔ یہ مسائل ساٹھ کی دہائی سے قبل کا تسلسل بھی ہیں اور عالمی صارفی معاشرے کے قیام کے بعد پیدا ہونے والی انسانی صورتِ حال کا آشوب بھی۔ فکری سطح پر ان شعرا نے اپنے معاصر ماحول سے عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے نئے انسان کی تلاش کو اپنا محور و مرکز بنایا ہے۔ ۱۹۷۰ء کے بعد تخلیق کیے جانے والی اُردو نظم حسی اور ادراکی دونوں اعتبار سے اپنے وجود کا احساس دلاتی ہے۔

۷۰ کی دہائی سے تعلق رکھنے والے نظم نگاروں میں رزمیہ شاعری اور عظیم شعری تجربے کے حامل شعراء میں افضال احمد سید نمایاں نظر آتے ہیں۔ انہوں نے بیانیہ اور مکالماتی انداز اختیار کیا اور نظم میں بین الاقوامی خاص طور پر تیسری دنیا کے پسے ہوئے مفلوک الحال عوام کے مسائل پر قلم اُٹھایا ان کی نظمیں استحصالی معاشروں میں پلنے والے نادار اور مفلس عوام کے جذبات کی ترجمانی کرتی ہیں۔ ان کی بیش تر نظمیں ۱۹۷۰ء میں بیروت میں قیام کے دوران آنکھوں دیکھے مشاہدات کی ترجمان ہیں اسی لیے ان کی نظموں کی مجموعی فضا استعاراتی اور علامتی ہے۔ ان کی نظموں میں تواتر کے ساتھ قیدیوں والی ونیز، سرچ لائٹس، سیکورٹی ایجنسیز درختوں سے لٹکتی لاشوں، ڈیتھ سرٹیفکیٹس،

رینجرز، پولیس اور اس نوعیت کے دیگر الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ جو اس دور کی عسکری جارحیت کے ترجمان ہیں۔ عرفان اسلم لکھتے ہیں کہ:

"Its Interesting to note that Ifzal syed had witnessed civil wars in Beirut in 1970's during his stay there as a university student and Dhaka in 1971 and he has been living in the volatile karachi for decades. All these cities went through crises and violence which recur in his poem."(1)

''فوجی ورجل کی زمین چھین لیتے ہیں''، ''رابرٹ کلائیو''، ''دریائے سندھ ہمارے دُکھ کیوں نہیں بہا لے جاتا'' اور ''ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم'' ایسی نظمیں ہیں جن مینعسکری جارحیت کا اظہار ملتا ہے۔ نظم ''ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم'' کا آغاز بکتربندگاڑیوں اور رزمیہ ماحول سے ہوتا ہے لیکن شاعر افسردگی کے عالم میں اس ماحول سے قبل ہونے والے آخری خوش گوار واقعہ کا تذکرہ نہایت حسرت سے کرتا ہے۔ نظم دیکھیے اور عسکری جارحیت کے عوام کی زندگیوں پر بداثرات کا اندازہ لگائیے:

رینجرز کی موبائیلوں
اور بکتر بند گاڑیوں کے آنے کے بعد
ٹینکوں کے آنے سے پہلے
وہ کھلونوں کی دکانوں سے نکل کر
ہماری سڑکوں پر آگئے
اپنے پہیوں والے سفید ڈبوں کے ساتھ
جن کے اوپر خوبصورت چھتریاں لگی تھیں
وہ سٹرابری اور ونیلا کی زبان میں بات کرتے تھے
ان کے پاس لوگوں کو متوجہ کرنے کے لیے
ایک دلکش دھن تھی
ان کی
ایک آئس کریم کو متعارف کرانے کی مہم
ہمارے شہر کے لیے آخری خوش گوار حیرت تھی(۲(

نظم ''مٹی کی کان'' کا موضوع کرئہ ارض پر بسنے والا ایسا انسان ہے جس کی تخلیقی اور بشری صلاحیتوں پر پابندیاں عائد کرکے اسے ناکارہ بنا دیاگیا ہے۔ ان کی دیگر نظموں میں بھی سماجی اور معاشرتی پابندیاں انسان کو جکڑے ہوئے دکھائی دیتی ہیں۔ نظم مٹی کی کان میں انسانی زندگی کے مختلف مراحل دکھانے کے لیے تمثیلی پیرائے میں عروج وزوال اور اُتارچڑھائو کو بیان کیا گیا ہے۔ اس نظم کے متعلق طارق ہاشمی رقم طراز ہیں کہ:

''تجریدی افسانے کے پیرائے میں لکھی گئی اس نظم میں شاعر نے کئی ایک کردار دکھائے ہیں، جو مختلف انسانی رویوں کی علامتیں ہیں۔''(۳(

تیسری دنیا کے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک سے تعلق رکھنے والے غریب مزدور اس طرح اس استحصالی نظام میں جکڑے ہوئے ہیں کہ اُن کا خون تک نچوڑ لینا عام بات سمجھی جاتی ہے۔ اس نظم میں بھی ایسے ہی جذبات کا اظہار کیا گیا ہے یہ مصرعے دیکھیے:

اگر نگرانوں کو معلوم ہو جائے
کہ ہم نے مٹی کی کان میں آنے سے پہلے پانی پی لیا تھا
تو ہمیں شکنجے میں الٹا لٹکا کر
سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے
اور پانی کے جتنے قطرے برآمد ہوتے ہیں
اتنے دنوں کی مزدوری کاٹ لی جاتی ہے(۴(

''مٹی کی کان'' میں کام کرنے والا مزدور جو خود تو استحصالی نظام سے جان نہیں چھڑا سکا لیکن وہ ایک ایسا آدمی بنانے کا خواہش مند ہے جو کسی کے زیرنگیں نہ ہو جو اس کان میں مزدوری نہ کرے بلکہ اس کو تمام وسائل مرکزی کردار خود مہیا کرے گا نظم کے اختتام میں وہ اپنا دریا بیچ کر پل خرید لیتا ہے اور اس امرپر افسوس کا اظہار بھی کرتا ہے بقول طارق ہاشمی:

''کردار کا یہ عمل تخلیقی اقدار سے گریز اور کاروباری اقدار کی طرف اس کے رجوع کو ظاہر کرتا ہے۔ کاروباری اقدار انسان کے وجود کی بقا کے لیے رزق تو بہم پہنچا سکتی ہیں لیکن اُسے وہ تہذیبی ابدیت سے ہم کنار نہیں کر سکتیں جو صرف تخلیقی قدروں کے باعث نصیب ہوتی ہیں۔ کاروباری اقدار کو اختیار کرکے انسان نسل در نسل مٹی کی اس کان میں مزدوری کر رہا ہے اور اپنے نگرانوں کا جبر سہہ رہا ہے۔''(۵(

نظم کے آخری مصرعوں میں شاعر ایک مرتبہ پھر استبدادی ہاتھوں میں جاپہنچتا ہے اور پھر سے مٹی کی کان میں نوکری کر لیتا ہے گویا استحصالی نظام کے پنجے معاشرے میں اس قدر مضبوطی سے پیوست ہیں کہ ان سے چھٹکارا پانا انسان کے بس سے باہر ہے:

اور ایک دن جب
سورج کا سایہ میری چھتری سے چھوٹا ہوگیا
میں نے چھتری بیچ دی
اور ایک روٹی خرید لی
کسی بھی تجارت میں یہ آخری سودا ہوتا ہے
ایک رات
یا کئی راتوں کے بعد
جب وہ روٹی ختم ہو گئی
میں نے نوکری کر لی
نوکری مٹی کی کان میں ملی(۶(

افضال احمد سید کے ہاں عام انسان کی زندگی کا بیانیہ بڑے دردناک پیرائے میں سامنے آتا ہے۔ صورتِ حال اُس وقت اور بھی تشویش ناک ہوجاتی ہے جب وہ اپنے اردگرد لوگوں کو زندگی کی تمام تر آسائشوں سے لطف اندوز ہوتے دیکھتا ہے۔ جن معاشروں کی بنیاد ہی مادیت اور دولت کی غیرمنصفانہ تقسیم پر رکھی جاتی ہے وہاں کے لوگ کھوکھلی تہذیب کو جنم دیتے ہیں انسان سے انسان کا واسطہ صرف اور صرف غرض تک محدود ہو جاتا ہے۔ ایسے حالات میں انسان کا تخاطب بھی خود ہی سے ہوتا ہے یہی گٹھن اور انتشار نظم ''ایک نئی زبان سیکھنا میں'' نظر آتا ہے۔ درحقیقت یہ ہمارے معاشرے کے زوال آمادہ رویوں پر گہری چوٹ ہے۔ چند مصرعے ملاحظہ کیجیے:

سمندر کے قریب
ایک عمارت میں
جہاں میرے
اور پڑوس کے کتے کے سوا
کوئی تنہا نہیں پہنچتا
میں ایک نئی زبان سیکھ رہا ہوں
اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لیے(۷(

موجودہ ترقی یافتہ دور میں ہر انسان اپنے فائدے اور بقا کی جنگ لڑرہا ہے۔ خوف اور دہشت کی فضا میں سانس لینے والے انسان اپنے ہاتھ کاٹ لینا اور ہونٹ سی لینا بخوبی جانتے ہیں ان کی نظم 'امینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی'' کا مرکزی کردار معاشرے میں حق کے لیے آواز اٹھانے والوں کے انجام سے بخوبی واقف ہے۔ اس نظم کے موضوع کی طرح اس میں موجود انگلش ڈکشن کا استعمال نظم کی انفرادیت کا باعث ہے:

امینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
اس اخبار میں
جس کے ۱۶فیصد پڑھنے والے
ہمارے پرکپٹاانکم سے ۲۰گنا زیادہ
جوتوں اور لباس پر صرف کرتے ہیں
امینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
ٹوتے پھوٹے اینکڈوٹس کے بجائے
سوئٹزر لینڈ کے بینکوں کے اکائونٹ نمبر
جہاں ہم سے لوٹی ہوئی دولت جمع ہے
امینہ جیلانی کیوں نہیں لکھتی
کہ ٹیسی ٹس نے لکھا
نیروکو چار گھوڑوں کے رتھ میں چڑھنے کی پرانی خواہش تھی
وہ چار گھوڑوں کے رتھ کو

سیاہ مرسیڈیز میں تبدیل کیوں نہیں کرتی
امینہ جیلانی سنسی پھیلانے کے لیے کیوں نہیں لکھتی
ایک مشہور ائیر لائن میں
مسافروں کو کتے کا گوشت کھلایا جاتا ہے
امینہ جیلانی
پامال موضوعات
ماورائے عدالت قتل یا پانی کے قحط کو کیوں نہیں چھوتی
ایسا نہیں ہے کہ امینہ جیلانی
نوک دے پوم یا پولینٹا پکانے کی ترکیبیں لکھا کرتی ہے
امینہ جیلانی جانتی ہے
کلفٹن کا پل بہت مضبوط ہے
اور اس کا یہ سال ایک حادثے سے شروع ہوا ہے
امینہ جیلانی جانتی ہے
ڈاکوئوں سے مقابلے کے دوران
جیپ سے کچلا جانے والا دنداں ساز
ابھی تک کوما میں ہے(۸(

''مٹی کی کان'' میں جہاں بیروت اور بنگلہ دیشی عوام جنگی خطرات سے نبردِآزما نظر آتے ہیں۔ وہاں کراچی جیسے روشنیوں کے شہر میں لاشوں کے انبار بے کنار کے مناظر بھی نظر آتے ہیں۔ نظم ''ہمیں بہت سے پھول چاہئیں'' شاعر کی دل گرفتگی کی گواہ ہے جو وہ کراچی کے معصوم شہریوں کے لیے محسوس کرتا ہے:

ہمیں بہت سے پھول چاہئیں
مارے جانے والے لوگوں کے قدموں میں رکھنے کے لیے
ہمیں بہت سارے پھول چاہئیں
بوریوں میں پائی جانے والی لاشوں کے چہرے ڈھانکنے کے لیے
ایک پوری سالانہ پھولوں کی نمائش
ایدھی سردخانے میں محفوظ کر لینی چاہیے(۹(

جہاں افضال احمد سید نے قومی اور بین الاقوامی واقعات کو گرفت میں لیا ہے وہیں چھوٹے چھوٹے روزمرہ کے معمولی واقعات اور جنسی لذتیت کو بھی نظموں کا موضوع بنایا ہے۔ ایسی نظموں میں پورنوگرافی کی کتابوں کا بھی ذکر ہے اور بلوپرنٹ کیسٹس کا بھی۔ کہیں وہ لینن کو فہمیدہ ریاض کے حضور لاتے ہیں اور کہیں سیزر کے قتل کے وقت قلو پطرہ کی غیرموجودگی پر سوال اٹھاتے ہیں۔ کہیں یانیہ کی مفتوح عورتوں سے گیت گواتے ہیں تو کہیں سوربوں کی سابق طالبہ کی قید کا احوال بیان کرتے

ہیں۔ غرض ان کی نظموں میں انسان ایک علاقے سے دوسرے علاقے تک سفر کرتا رہتا ہے۔ تاریخ ان کی نظموں میں بار بار زندہ ہوتی ہے۔ نظم ''روکو کو اور دوسری دنیائیں'' کے چند مصرعے دیکھیے:

ایلیاس کانیتی نے لکھا
گویا جانبدار تھا
ماہا برہنہ
ماہا ملبوس اور
بالکنی پر ماہائیں بنانے والا
اس کی روکوکودنیا
تین مئی کو میڈرڈ کی ایک تاریک گلی میں ختم ہو گئی(۱۰(

اس نظم میں گویا اسپین کا معروف مصور ہے جبکہ روکو کو اٹھارویں صدی میں یورپ بھر میں مقبول ہونے والی مصوری کی تحریک کا سرکردہ ہے۔ جس میں نہایت نزاکت کے ساتھ امرا کے طبقے کی فرصت کے مشاغل کی عکاسی کی جاتی تھی۔ ان نظموں کے متعلق انیس ناگی کی رائے اہمیت کی حامل ہے کہ:

''افضال احمد سید نے اپنے سامنے موجود تمام مظاہر کو اپنی شعری دنیا کا جزو بنا لیا ہے۔ وہ متضاد تشبیہیں اور استعارے تعمیر کرتے ہیں اور افہام کی سطح کو برقرار رکھتے ہیں لیکن ''دوزبانوں میں سزائے موت'' میں ان کا شعری پرسیپشن بگڑنے لگتا ہے۔ وہ پرانی تہذیبوں کے کرداروں کو زمانہ حال میں لا کر ان سے مکالمے کرتے ہیں پیراڈوکس سے کام لیتے ہیں۔۔ افضال احمد کی نظموں کی سادہ زبان بعض اوقات موثر ہوتی ہے لیکن اکثر اوقات نظموں کو سپاٹ بنا دیتی ہیں۔ نثری نظم کا اپنا ایک داخلی آہنگ ہوتا ہے جسے افضال احمد سید نظر انداز کر دیتے ہیں۔''(۱۱(

مٹی کی کان میں موجود پہلے حصے میں شامل نظمیں فن اور فکر دونوں اعتبار سے زیادہ پُراثر ہیں نسبتاً باقی مجموعوں کے ڈاکٹر ضیاالحسن ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''ان کی نثری نظمیں ایسے محدود ذہن نقادوں کی اس رائے کا جواب ہیں کہ نثری نظم میں اعلیٰ درجے کی شاعری نہیں ہو سکتی۔''(۱۲(

انسان دنیا میں آنے کے بعد ہر طرح کے مسائل سے نبردآزما ہوتا ہے اور پھر بھی زندگی کے مسائل اُس کا خاتمہ نہیں کر پاتے تاہم موت اٹل حقیقت ہے جو انسانوں کو پورا پورا تقسیم کر دیتی ہے۔ اپنی ایک نظم ''میں کچھ نہ کچھ بچ جاتا تھا'' میں شاعر اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ دنیا کے ہر غم اور مصیبت سے بچ کر نکلا جاسکتا ہے لیکن موت سے نہیں۔ مختصر سی یہ نظم شاعر کی فکری اپج کا کھلا اظہار کرتی ہے:

مجھے فاقوں سے تقسیم کیا گیا
میں کچھ نہ کچھ بچ گیا
مجھے توہین سے تقسیم کیا گیا

میں کچھ نہ کچھ بچ گیا
مجھے ناانصافی سے تقسیم کیا گیا
میں کچھ نہ کچھ بچ گیا
مجھے موت سے تقسیم کیا گیا
میں پورا پورا تقسیم ہو گیا(۱۳(

افضال احمد سید کی نظموں میں دورِحاضر کی دوغلی اور منافقانہ زندگی کو ہدف تنقید بنایا ہے وہ انسانوں کے دوہرے چہرے اور دوہرے رویوں کو ہدف تنقید بناتے ہیں اس مقصد کے لیے انہوں نے جگہ جگہ استعاروں سے کام لیا ہے۔ نظم ''قدیم تلواروں کا زنگ'' میں استعمال ہونے والے استعارے دیکھیے:

تم ایک سیاہ سورج مکھی
میں ایک سورج اور ایک گہن
تم شیشہ ہو
اور میں ریت کا زرہ (۱۴(

جدیداُرد و نظم میں فرد کے مسائل کے اظہار کے لیے تہہ در تہہ علامتوں کو استعمال کیا گیا۔ علامت نگاری کے پنپنے میں سیاسی و سماجی حالات اور عصری جبر نے کلیدی کردار ادا کیا۔ان کے پہلے شعری مجموعے ''چھینی ہوئی تاریخ میں بہت سی نظمیں استعاراتی اور علامتی زبان میں لکھی گئیںجو معاصر صورتِ حال کا گہرا ادراک رکھتی ہیں ۔ نظم ''تل زعتر سے نشیب'' میں لکھتے ہینکہ:

''میں بادلوں کا وہ ٹکڑا ہوں
جسے پتھر سے باندھ کر
ڈوبنے کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے
میرا کوئی خاندانی قبرستان نہیں ہے
کرائے کے فوجیوں کا گھرانہ
وطن سے دور مرنے کی رسم(۱۵(

اس نظم میں انہوں نے جگہ جگہ اچھوتے استعاروں سے کام لیا ہےڈاکٹر ضیاء الحسن کے خیال میں انہوں نے اپنی نثری نظم کے لیے ایک بالکل نئی استعاراتی زبان وضع کی ہے جس کااظہار نثری نظم کے علاوہ کسی اور صنف شعر میں ممکن نہیں ہے۔ اس نظم کے آخری چند مصرعے دیکھیے:

چاند آسمان پر شہد کا چھتا ہے
میں اسے ریچھ بادلوں کے حملے سے بچانے جا رہا ہوں(۱۶(

افضال احمد سید نے بعض نظموں میں مکالماتی انداز بھی اختیار کیا ہے۔ مکالماتی نظموں میں ''شاعر اور تلوار کا گیت'' اہمیت کی حامل ہے۔ انہوں نے نظموں میں بطور خاص تیسرے درجے کے ترقی پذیر ممالک کے مسائل کو موضوع سخن بنایا ہے۔ خاص طور پر ملٹی نیشنل کمپنیوں کے چھا جانے کے بعد سماجی ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیاں اور استحصالی نظام کے زیرِاثر مزدوروں اور محنت

کشوں کے روزمرہ کے حالات ان کی نظموں میں کئی سوالات اٹھاتے ہیں۔ نظم ''زندگی ہمارے لیے آسان کر دی گئی ہے۔'' میں ایسے ہی طبقے کی نشاندہی کی گئی ہے جو رعایتی قیمت پر کپڑے کتابیں اور دیگر ضروریات حاصل کر سکتے ہیں۔ درحقیقت اس نظم میں انسانوں کی بے وقتی اور کم مائیگی کا اظہار ملتا ہے:

زندگی ہمارے لیے آسان کر دی گئی ہے
ہم کسی بھی رعایتی فروخت میں
کتابیں،
کپڑے، جوتے
حاصل کر سکتے ہیں
جیسا کہ گندم ہمیں امدادی قیمت پر مہیا کی جاتی ہے
اگر ہم چاہیں
کسی بھی کارخانے کے دروازے سے
بچوں کے لیے
ردکردہ بسکٹ خرید سکتے ہیں
تمام طیاروں، ریل گاڑیوں، بسوں میں ہمارے لیے
سستی نشستیں رکھی جاتی ہیں
اگر ہم چاہیں
معمولی ضرورت کی قیمت پر
تھیٹر میں آخری قطار پربیٹھ سکتے ہیں
ہم کسی کو بھی یاد آسکتے ہیں
جب اسے کوئی اور یاد نہ آ رہاہو(۱۷(

ستر کی دہائی میں لکھی جانے والی نظموں میں افضال احمد سید کی نظمیں اپنے موضوعات، فکر اور فنی رچائو کی بدولت ممتاز نظر آتی ہیں۔ بیرونِ ملک مقیم رہنے کی بنا پر ان کے ہاں انگلش الفاظ کا استعمال کثرت سے نظر آتا ہے۔ ان کے اسلوب میں انگریزی الفاظ اس حد تک رچ بس گئے ہیں۔ایک مثال دیکھیے:

صبح اُسے
ٹرالیوں کے گلوانائزڈ لوہے کی چھتوں والے گودام
اور ساٹھ گھوڑوں کے اصطبل کا دورہ کر ایا گیا
ٹرام وے کی افتتاحی تقریب میں
کراچی کی سب سے خوبصورت لڑکی
خوش نظر آرہی تھی(۱۸(

افضال احمد سید کی سوچ فکری اعتبار سے گہرائی لیے ہوئے ہے وہ بعض اوقات نہایت سادہ الفاظ میں بہت گہری باتیں آسانی سے کہہ جاتے ہیں۔ ان کی باتوں میں کوئی نہ کوئی فلسفیانہ نکتہ ہوتا ہے اور بعض باتیں تو کوٹ کرنے کے قابل ہوتی ہیں جن کا حوالہ دیا جاسکتا ہے نظم اگر کوئی پوچھے میں لکھتے ہیں:

اگر کوئی پوچھے
کہ درخت اچھے ہوتے ہیں یا چھتریاں
تو بتانا کہ درخت
جب ہم دھوپ میں ان کے نیچے کھڑے ہوں
اور چھتریاں
جب ہم سفر کر رہے ہوں
اور سفر اچھا ہوتا ہے ان منزلوں کا
جہاں جانے کے لیے
کئی ارادے
اور کئی سواریاں بدلنی پڑتی ہوں
حالانکہ سفرتو انگلی میں چبھ جانے والی
سوئی کی نوک کا بھی ہوتا ہے
اور اس آنکھ کا بھی
جو اسے دل میں جاتا ہوا دیکھتی ہے(۱۹(

افضال احمد سید کی شاعری میں کہیں کہیں خانگی حالات اور اپنے اردگرد رہنے والے افراد کے ذاتی حالات بھی در آتے ہیں۔ اس طرح ان کی نظمیں ان کی روداد زندگی معلوم ہونے لگتی ہیں ان نظموں میں حساسیت کا عنصر بڑھ جاتا ہے۔ ایسی نظموں میں انتشار کی کیفیت ملتی ہے۔ جو نظم کے شروع سے آخر تک ساتھ چلتی ہے۔ بعض نظموں پر ان کی اہلیہ کی شاعری کے اثرات بھی محسوس ہوتے ہیں جو اتفاقیہ صورتِ حال کا نتیجہ ہیں:

جب میں شاعری کرنا چاہتا ہوں
اپنے پسندیدہ موسم کے شروع ہونے پر
یا اس لڑکی پر
جسے سائیکیا ٹرسٹ نے برقی صدمے کی مقدار زیادہ دی
اور وہ مجھے بھول گئی(۲۰(

نظم ''میں ڈرتا ہوں'' میں ذہنی انتشاء کی کیفیت دیکھیے:

روٹی کو میں نے چھوا
اور بھوک شاعری بن گی
انگلی چاقو سے کٹ گئی

اور خون شاعری بن گیا
گلاس ہاتھ سے گر کر ٹوٹ گیا
اور بہت سی نظمیں بن گئیں(۲۱(

۱۹۷۰ء کے بعد اُردو نظم میں عصری آگہی شہر آشوب کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ اس دور کی نظم ترقی پذیر ممالک خاص طور پر تیسری دنیا سے تعلق رکھنے والے ممالک کے مسائل و مشکلات کا گھیراؤ کر تی ہے۔ افضال احمد سید کی شاعری بین الاقوامی رزمیہ واقعات، عصری ہم آہنگی اور عالمی صارفی معاشرے کے ردِعمل کے طورپر سامنے آتی ہے۔ خاص طور پر جنگ کے دنوں کے حالات وواقعات ان کی نظموں میں پورے پس منظر اور پیش منظر کے ساتھ ظاہر ہوتے ہیں۔ انہوں نے کرئہ ارض پر بسنے والے انسانوں سے متعلقہ موضوعات کو نظم کا حصہ بنایا ہے وہ اپنے اسلوب، ذخیرئہ الفاظ اور موضوعات کی بدولت اُردو نظم میں نمایاں نظر آتے ہیں۔

حوالہ جات:

(1) Irfan Islam, Portrayal of dark realities of life, Dawn, 21 June 2015
)۲(افضال احمد ، سید، مٹی کی کان ، کراچی، آج کی کتابیں، ۲۰۰۹ء، ص:۳۰۸
)۳(طارق ہاشمی، اُردو نظم اور معاصر انسان، اسلام آباد: پورب اکادمی، ۲۰۱۵ء، ص:۱۹۲
)۴(افضال احمد، سید، مٹی کی کان، ص:۲۷
)۵(طارق ہاشمی، اُردو نظم اور معاصر انسان، ص:۱۹۳
)۶(افضال احمد، سید، مٹی کی کان، ص:۳۳
)۷(ایضاً،ص:۱۷۰
)۸(ایضاً،ص:۳۲۸
)۹(ایضاً،ص:۲۹۲
)۱۰(ایضاً،ص:۲۷۴
)۱۱(انیس ناگی، پاکستانی اُردو ادب کی تاریخ،لاہور: جمالیات،۲۰۰۴ء، ص:۱۶۳
)۱۲(ضیاالحسن، ڈاکٹر، جدید اُردو نظم آغاز و ارتقا، لاہور: سانجھ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص:۱۰۷
)۱۳(افضال احمد، سید، مٹی کی کان، ص:۶۷
)۱۴(ایضاً،ص:۴۳
)۱۵(ایضاً،ص:۱۹
)۱۶(ایضاً،ص:۲۴
)۱۷(ایضاً،ص:۲۶۰
)۱۸(ایضاً،ص:۲۹۴

)١٩(ايضاً،ص:٢٣٩
)٢٠(ايضاً،ص:١١٠
)٢١(ايضاً،ص:١١١
/...../